(غلام گردش)

سوال پوچھنے کی اجازت نہیں ہے!

گلیلو اٹلی میں پیدا ہوا۔ یہی کوئی ساڑھے چار سو برس پہلے۔ اسکی شخصیت کا سب سے بڑا کمال تھا کہ ہر عمل کو دلیل کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بیک وقت، فلسفی، انجینئر، ماہر فلکیات، سائنسدان اور نہ جانے کس کس علم کا ماہر تھا۔ جس دنیا میں آج ہم موجود ہیں، اس میں گلیلو کی ایجادات اور نظریہ ہر دم استعمال ہوتی ہیں۔ اسکے متعلق لکھتے ہوئے اپنی جہالت کا بخوبی اندازہ ہو رہا ہے۔ گلیلو، جوان عمری میں چرچ کے اجتماع میں بیٹھا وعظ سن رہا تھا۔ نظر چھت پر ٹنگے ہوئے فانوس پر تھی۔ ہوا کے زور سے فانوس جھول رہا تھا۔ گلیلو نے ایک عجیب چیز محسوس کی۔ اگر فانوس لمبے دورانیہ کیلئے جھولتا تھا یا کم دورانیے کیلئے، وقت بالکل ایک جیسا ہی لگتا تھا۔ اس وقت گھڑی تو تھی ہی نہیں۔ چنانچہ گلیلو اپنے ہاتھ کی نبض کو بطور گھڑی استعمال کر رہا تھا۔ جب یہ بات اپنے ساتھیوں کو بتائی تو سب نے خوب مذاق اُڑایا۔ کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ہوا میں کم یا زیادہ لمبائی میں جھولے، مگر اسکا دورانیہ ایک جیسا رہے۔ یہ ناممکن ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر گلیلو اگلے دو برس اس پر کام کرتا رہا۔ اس نے پنڈولم ایجاد کیا اور اسے وقت کے ساتھ منسلک کر کے اپنی تھیوری کو درست ثابت کر دیا۔ مگر اس پورے دورانیے میں گلیلو کا بھرپور ٹھٹھہ اُڑایا گیا۔ اسکی ہر جگہ تضحیک کی گئی۔ یہ تمام ہزیمت گلیلو کو دلیل پر سوال و جواب کرنے سے نہ روک سکی۔

بالکل اسی طرح، یونانی فلسفی ارسطو تحقیق سے یہ گردانتا تھا کہ زمین پوری کائنات کا محور ہے۔ مکمل طور پر ساکت ہے اور تمام سیارے، اسکے اردگرد گھومتے ہیں۔ اس وقت کا چرچ بھی انہی خیالات کا مالک تھا۔ گلیلو دلیل کی بنیاد پر فلسفہ پیش کر رہا تھا کہ زمین ساکت نہیں ہے۔ سورج کے اردگرد توازن سے گھومتی ہے۔ تمام سیارے زمین کے اردگرد نہیں بلکہ سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ ایک ایسی انقلابی بات، سوال و جواب تھا کہ یورپ میں علمی زلزلہ آ گیا۔ گلیلو کو نہ صرف حکومتی جبر کا سامنا کرنا پڑا۔ بلکہ اسے چرچ کی عدالت کے سامنے بطور مجرم پیش کیا گیا۔ شدید ذہنی دباؤ کا نشانہ بنایا گیا۔ درجنوں پادریوں، پوپ اور بادشاہ کے درباریوں نے اسکے خلاف مقدمہ کی بھرپور پیروی کی۔ گلیلو مکمل طور پر تنہا تھا۔ اتنے طاقتور لوگوں کی منفی سوچ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چرچ نے فیصلہ کیا کہ آئندہ گلیلو کوئی سائنسی سوال نہیں اُٹھائیگا۔ کوئی کتاب نہیں لکھے گا اور پوری عمر اپنے گھر میں نظر بند رہیگا۔ اسے بدترین ظلم کا سامنا کرنا پڑا۔ جیل میں اپنے خیالات کی وجہ سے نظر بند بھی رہا۔ مگر کوٹھری کی دیوار پر اپنے خون سے لکھا، کہ ''زمین حرکت میں رہتی ہے''۔ یہ کالم گلیلو جیسے عظیم انسان کے علمی کام پر ہرگز ہرگز نہیں لکھ رہا۔ گزارش صرف ایک ہے کہ عمومی خیالات کے برعکس دلیل کی بنیاد پر سوال اُٹھانا آج بھی اتنا ہی مشکل اور تکلیف دہ ہے جتنا سینکڑوں برس پہلے۔ المیہ آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا۔ ماضی میں سوال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس وقت بھی جدت، سماجی رویوں، فرسودہ خیالات کے متعلق بات کرنے کی اجازت نہیں تھی اور بدقسمتی سے آج بھی نہیں ہے۔ بلکہ صورتحال پہلے سے بھی بدتر ہے۔ اگر کوئی بھی شخص دلیل کی بنیاد پر کوئی مختلف نکتہ اُٹھائے، تو اب اسے قید نہیں کیا جاتا۔ اسے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سات سو برس پہلے جو فکری آزادی مسلمان ریاستوں میں موجود تھی، آج وہ مغرب میں تو موجود ہے۔ مگر مسلمان ممالک دلیل کی بنیاد پر سوال

وجواب سے عاری ہو چکے ہیں۔ یہ بالکل معمولی بات نہیں ہے۔ سات سو برس سے ہماری بربادی کی متعدد وجوہات میں سے ایک ہے۔ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اکثر مسلمان ممالک فکری طور پر بالکل اسی سطح پر زندہ ہیں، جتنا یورپ اتنے عرصے پہلے تھا۔ ہاں اب، تحقیقی سمتیں متضاد ہو چکی ہیں۔ اب سائنس، علم، فلسفہ، تحقیق مغرب کا اوڑھنا بچھونا ہے اور جنگ، تشدد پسندی، دہشت گردی ہماری میراث ہے۔ جہالت کا لفظ نہیں لکھ رہا۔ اسلیے کہ اکثر لوگ ناراض ہو جائینگے۔ مگر جہالت کے لفظ سے بہتر ہماری صورتحال کی عکاسی کوئی اور لفظ نہیں کر سکتا۔

تعلیمی درسگاہوں کی بات بعد میں کرونگا۔ ہمارے گھروں میں جب کسی بچے یا بچی کی ولادت ہوتی ہے۔ اسے آہستہ آہستہ اردو، انگریزی، پنجابی، پشتو اور دیگر زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ یہ بالکل عام سا گھریلو رویہ ہے۔ مگر ایک چیز سے اس معصوم کو دور رکھا جاتا ہے۔ اور وہ ہے ''سوال پوچھنے کی عادت''۔ بچپن کے زمانے کو بغور یاد کیجئے۔ کہ اگر کوئی بچہ یا بچی بنیادی معاملات میں کوئی پیچیدہ سوال پوچھ لے تو یا تو والدین اسے ڈانٹ کر ڈرا دیتے ہیں یا اسے تھپڑ مار کر باور کروا دیتے ہیں کہ اسطرح کے سوال بالکل نہیں پوچھنے چاہییں۔ نتیجہ کہ ذہنی تجسس تو موجود رہتا ہے مگر اسکی کاشت خوف کی زمین میں پیوست ہو جاتی ہے۔ بچہ اس خوف سے پوری عمر باہر نہیں نکل سکتا۔ سکول اور کالجوں میں بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی درسی کتابوں کے بوجھ سے لاد دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی اُستاد یہ نہیں کہتا کہ بیٹا، فکر کرو، سوچو۔ اگر آپ درسی کتابوں کے باہر سے معمولی سا بھی سوال کریں تو ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہی کہ بچہ، فکری خوف کے ساتھ بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس اَمر میں عافیت نظر آتی ہے کہ صرف اور صرف ایک مخصوص طریقے سے سوچے اور بس، اسی طرح زندہ رہے۔ یونیورسٹیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے پورے ملک میں بین الاقوامی سطح کی کوئی یونیورسٹی یا درسگاہ موجود نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتی۔ پاکستانی یونیورسٹیوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ صرف بارہ دن کیلئے ایک یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات پڑھنے گیا تھا۔ پروفیسر تو خیر حد درجہ لائق تھے۔ مگر وہاں چند طلباء کا زور تعلیم پر نہیں بلکہ اس بات پر تھا کہ کوئی طالبعلم کسی طالبہ سے گفت وشنید تو نہیں کر رہا؟ کہیں بچے اور بچیاں زور سے قہقہے تو نہیں لگا رہے؟ چند دنوں میں اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا دیکھ سکتا تھا۔ لہذا خاموشی سے اس کورس اور ادارے سے کنارہ کشی کر لی۔

فکری خوف بچپن کی دہلیز سے لیکر مرنے تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ساٹھ سال کی عمر میں ہم سوال کرنے سے اتنا ہی گھبراتے ہیں جتنا بیس پچیس برس کی عمر میں۔ اسلیے کہ ہماری تعلیم اور سماجی ماحول کسی بھی بحث کا حامل نہیں ہو سکتا۔ ہمارا جو سماجی بیانیہ مصنوعی طریقے سے بنا دیا گیا ہے اس سے انحراف اب نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس اور تحقیق کی بنیاد پر اگر آپ کچھ بھی پوچھنے کی ہمت کرینگے تو آپکا جینا محال کر دیا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں تقریباً دو ارب مسلمان ہونے کے باوجود ہم تحقیق کی دنیا میں کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ پچاس ایسے ممالک ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، مگر وہاں کسی طور پر بین الاقوامی معیار کی تعلیمی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں موجود نہیں ہیں۔ ان پچاس ملکوں میں کوئی بھی اختلافی بات کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ بار بار عرض کر رہا ہوں کہ بچپن سے لیکر موت تک ہمیں مخصوص انداز میں سوچنے کی تربیت دیجاتی ہے۔ آپ کوئی چبھتا ہوا سوال نہیں پوچھ سکتے۔ یہ وہ المیہ ہے جس پر ہمارے ہاں بات نہیں ہوتی۔ بتایا جاتا ہے کہ

ملک میں یونیورسٹیوں کا جال بچھادیاہے۔پتہ نہیں کہ وہ جال ہے یافکری موت کے قبرستان ہیں۔مگرکیاآج تک کسی صدر،وزیراعظم،وزیراعلیٰ،تاجریاکاروباری ادارے نے کہاہے کہ اس نئی تعلیمی درسگاہ کوکیمرج،ہارورڈ،نیویارک یونیورسٹی،برکلے یااسطرح کے اداروں کی سطح پرلے کرجائینگے۔سوال ہی پیدانہیں ہوتا۔مانیں یانہ مانیں،ہم اپنے تمام تعلیمی اداروں میں طلباء یاطالبات کوذہنی قفل لگاکررکھتے ہیں۔اندازہ ہے کہ اسکی چابی کہاں ہے۔ذہنی گھتیاں کیسے کھلتی ہیں۔مگروہ چابی ہم نے جہالت کے سمندرمیں اسطرح پھینک دی ہے کہ ڈھونڈنے پربھی دوبارہ حاصل نہیں کرسکتے۔

میرے ایک عزیز دوست کا بیٹا پانچ برس پڑھنے کیلئے لندن کی کیمرج یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔کچھ عرصہ پہلے،دوست اپنے بیٹے کو ملنے کیلئے یونیورسٹی گیاتواسے ہاسٹل اورکلاس روم میں بیٹانظرنہ آیا۔خیرکیمرج دنیا کی محفوظ ترین جگہ ہے۔اسے اندازہ تھا کہ برخوردارنزدیک ہی ہوگا۔ڈھونڈنے نکلاتودس منٹ میں ایک تین سوبرس پرانے پُل پرسائیکل کھڑی کرکے اکیلا بیٹھاہواتھا۔والدنے پوچھاکہ بیٹاکیاکررہے ہو۔جواب تھاکہ میرے پروفیسرنے حکم دیاہے کہ ہفتہ میں ایک دن کوئی کام نہ کرو۔بلکہ جوکچھ تمہیں پڑھایاجارہاہے اسکے متعلق غورکرو۔ہاں،قطعاًیہ مت سوچناکہ جوکچھ تمہیں تعلیم دی جارہی ہے۔وہ درست ہے۔بلکہ سوچو،تحقیق کرو،کہ تمہیں غلط پڑھایاجارہاہے۔دلیل کی بنیادپرکلاس میں آؤ اورثابت کروکہ تمہیں مکمل طورپرناقص اورمنفی تعلیم دی جارہی ہے۔میرادوست،اپنے بیٹے کی بات سنکردنگ رہ گیا۔جب لاہورآکریہ واقعہ سنایاتومیں بھی ششدررہ گیا۔کہ کیادنیامیں ایسی بھی درسگاہیں ہیں جواپنے آپکی دلیل کی بنیادپرنفی کررہی ہیں۔فرق صرف ایک ہے کہ وہاں ہرنوعیت،ہرطرح کاسوال کرنے کی بھرپورآزادی ہے۔وہ فکری آزادی جسکے متعلق ہم تصوربھی نہیں سکتے۔ہرچیزچھوڑدیجئے۔کرونا کی دوائی،امریکی،برطانوی،روسی،چینی سائنسدانوں نے بنائی ہے۔ہمارے پاس اس سطح کے سائنسدان اورمحقق کیوں موجودنہیں جوایک وباءکی دوائی تک بناسکیں۔اب ہم بڑے فخرسے کافروں کی بنائی ہوئی دوائی استعمال کررہے ہیں۔مسلمان ممالک سات سوبرس سے بنجرہیں اوراگلی کئی صدیاں بھی ایسے ہی رہینگے۔یہاں کوئی بھی گلیلو کی طرح نظریات کی بنیادپرقربانی دینے کیلئے تیارنہیں۔ذہن میں رکھیے کہ گزشتہ سات صدیوں سے ہمیں دلیل کی بنیادپرسوال پوچھنے کی اجازت نہیں ہے!پھرکسی ترقی اورکیسی جدت!

راؤمنظرحیات